کتابوں پر تبصرہ

فکرِ اقبال کے دو بنیادی تصوّرات

خودی اور آخرت

صلاح الدین ایوبی

نام کتاب	فکر اقبال کے دو بنیادی تصورات،خودی اور آخرت
مصنف	چودھری مظفر حسین
ناشر	اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور
قیمت	۱۵۰/-روپے
سال اشاعت	۲۰۰۱ء
مبصر	صلاح الدین ایوبی

چوہدری مظفر حسین نے خودی اور آخرت کے بارے میں علاّمہ اقبال علیہ الرحمہ کے نظریات کو قرآن حکیم کی کسوٹی پر پرکھا ہے۔علامہ کے یہ نظریات شروع ہی سے علمی ودینی حلقوں میں بحث و نقد کا نشانہ بنے رہے ہیں تاہم چوہدری صاحب کے بھرپور اور ہمہ جہت علمی تجزیے کی داد دینا پڑتی ہے کہ آپ علامہ کے افکار کو قرآن حکیم کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ چوہدری مظفر حسین کی اس اہم تصنیف کی اصل قدر ومنزلت جاننے کے لیے ڈاکٹر سید عبداللہ کا پیش لفظ ہی بہت کافی ہے۔ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> ''میں نے جب اس سلسلۂ مضامین کا مطالعہ کیا تو معاً میرے سامنے بہت سے اعتراضات ابھر آئے جو ایک زمانہ سے سنتا آیا تھا اور اب مظفر حسین کے مضامین میں ان کا جواب موجود ہے''۔(ص۱۲)

چوہدری صاحب نے بجا طور پر لکھا ہے کہ علامہ اقبال کے یہ نظریات فلسفیانہ غور وفکر کا ماحصل نہیں بلکہ قرآن حکیم میں گہرے تدبّر کا نتیجہ ہیں، (ص ۱۷) ''تصورِ خودی اور قرآن حکیم'' اس کتاب کا پہلا مضمون ہے۔اس مضمون میں خودی کے معانی کو بے نقاب کیا گیا ہے۔قرآن حکیم سے بہت سی آیات درج کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ''خودی'' کا لفظ ''نفس'' کا ہم معنی ہے۔خود اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے نفس کا لفظ استعمال کیا ہے اور انسان کی خودی کے لیے بھی نفس کی اصطلاح بہت ہی عام استعمال ہوئی ہے۔ جہاں تک نفس (خودی) کے اخلاقی مفہوم کا تعلق ہے،خودی کو مقصود بالذات مان کر عمل کرنا ہی اخلاق ہے۔خودی کو تباہ کرنے والی ہر شے بدی ہے اور اسے استحکام دینے والی ہر شے نیکی ہے۔آیاتِ قرآنی اس بات کی شاہد ہیں کہ خودی کی یکتائی اور اس کی بے مثل انفرادیت خودی کی نہایت

اہم اور بنیادی صفت ہے۔ خودی کی دوسری صفت اس کی خلوت و تنہائی ہے۔ یہ بات بھی واضح ہے کہ خودی مابعد الطبیعی حیثیت کی حامل ہے یعنی وہ موت کے بعد بھی اپنا مستقبل رکھتی ہے۔ خودی (نفس) کو کائنات میں مرکزی حیثیت حاصل ہے چنانچہ انسان کی ساخت میں اس کی کمزوری اور اس کا ظالم و جاہل ہونا، اوصاف خداوندی کے سائے میں آ کر نشو ونما کی صلاحیت سے شاد کام ہوتے ہوئے اپنی صفات کو تبدیل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں خودی کی بقاء کو تعلق باللہ سے مشروط کر دیا گیا ہے (ص، ۲۶) خودی کے بارے میں قرآن حکیم کی آیات کے حوالے سے اس گفتگو نے ساری گتھیاں سلجھا دی ہیں اور مشرق و مغرب کے دانشوروں نے اب تک جو کچھ اس بارے میں خلافِ حق بیان کیا تھا اس کا پردہ چاک کر دیا ہے۔

☆

تصورِ آخرت کے بارے میں علامہ اقبال کے افکار بھی قرآن پاک کی منشا کے تحت ہیں۔ علامہ لکھتے ہیں:

> انسان کے مر کر دوبارہ زندہ ہونے کا تصور یا نظریۂ ''حیات بعد موت'' مذہب کی تعلیمات کا ایک ایسا عنصر ہے جو سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے'' (ص، ۳۱)

علامہ بالکل سادہ الفاظ میں کہتے ہیں کہ ''وہ گویا بطنِ مادر کی طرح بطن مرقد سے باہر قدم رکھتا ہے'' (ص، ۵۵) اور یہ کہ ''برزخ کو موت اور بعد الموت کے درمیان توقف اور انتظار کی ایک حالت سے تعبیر کرنا چاہیے''۔ علامہ کے ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ ان کا تصورِ آخرت ٹھیٹھ اسلامی اعتقادات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، موت اور حیات بعد الموت کو وہ ایک سادہ عالمگیر حقیقت کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ (ص ۸۴)

دلچسپ بات یہ ہے کہ مفسرین و محدثین کی اکثریت برزخ کو ایک عالم (یعنی جہان) ایک مقام و مستقر تسلیم کرتی ہے جس کے لیے قرآن حکیم سے کوئی ثبوت فراہم نہیں ہو سکتا جبکہ علامہ اقبال بجا طور پر برزخ کو توقف اور انتظار کی ایک حالت قرار دیتے ہیں۔ اور یہی برحق ہے۔ یہ ایک اہم نکتہ ہے جس پر بہت سے قرآنی افکار کو درست یا غلط طور پر جاننے اور سمجھنے کا معاملہ مبنی ہے۔ مثال کے طور پر حیات شہید اور کنتم ازواجاً ثلاثہ کا معاملہ جس کے بارے میں آئندہ صفحات میں گفتگو کی جائے گی۔

حیات بعد الموت کو مرگِ خودی سے وابستہ جان لینا ایک اہم غلطی ہے۔ علامہ جب یہ کہتے ہیں کہ موت و حیات خودی کے احوال ہیں تو اس سے ان کی مراد حیات بعد الموت کا انکار نہیں بلکہ انسانی ذات، اس کی شخصیت، اس کے نفس کا تعلق باللہ سے گریز پا ہو کر ''ہر کہ بے حق زیست جز مردار نیست'' کے قعرِ مذلّت میں گر جانا ہے یا پھر اس کا ذاتِ حق سے ہم نوا ہو کر منزلِ مراد کو پا لینا ہے۔ اس اہم نکتے کو چوہدری مظفر حسین نے اس طرح بیان کیا ہے:

> چنانچہ ظاہر ہے کہ جس شخص میں تعلق باللہ کا داعیہ بیدار نہ ہو اس کی شخصیت کا ماورائی پہلو

نشو ونما سے محروم رہتا ہے۔ آخرت کی نورانی زندگی سے اسے کوئی حصہ نہیں مل سکتا اور اس اعتبار سے وہ بالکل مردہ ہے'' (ص ۴۵) یہی بات اس آیت قرآنی میں کہی گئی ہے وَمَـالَـهُ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ (شوریٰ ۲۰)'' اسے آخرت میں کچھ نہیں ملتا۔

☆

خودی اور آخرت کے بارے میں ان بنیادی افکار کی توضیح کے بعد چوہدری مظفر حسین لکھتے ہیں:

خودی کا پیغام وحدت الوجودی تصوف کے خلاف ایک طرح کا اعلان جہاد تھا جس سے اسلام کے نام پر پھیلائی ہوئی گمراہیوں کا ازالہ ہوا۔ (ص ۶۱)

کمالِ انسانیت حصول مقام عبدیّت ہے۔ (ص، ۶۰) قرآن حکیم میں کہیں بھی اتصال و اتحاد کی کسی ایسی کیفیت کا بیان نہیں ملتا جس میں انسان کی خودی کا خدا کی خودی میں مدغم یا گم ہو جانے کا اشارہ تک پایا جا سکتا ہے۔ اسلام میں انسان کی زندگی بعد موت، اُس کی شعوری کیفیات ہیں اور شعور کو مستقل بیدار رکھ کر ہی حیاتِ دوام حاصل ہو سکتی ہے۔ (ص ۶۵) اسی تسلسل میں علامہ اقبال نے فرمایا تھا کہ حیات بعد الموت ایک یقینی امر ہے بایں ہمہ بقائے دوام ہمارا حق نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہے (ص ۴۷)

وحدت الوجودی نظریات کے بالمقابل تصورِ خودی پیش کرتے ہوئے چوہدری صاحب نے اقبال کے اس نظریے کی وضاحت بھی کی ہے کہ علامہ جسم اور روح کی ثنویت کے قائل نہیں۔ وہ جسم اور روح کی ثنویت کو سراسر ایک غیر اسلامی تصور سمجھتے ہیں (ص ۷۱) اسی ضمن میں ''روح'' کی اصل حقیقت بھی واضح کر دی گئی ہے:

یوں دیکھا جائے تو امرِ ربّی ہی ہے جو انسانی جسم کو پیدا کر کے اس کے اندر خودی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے (ص ۶۸)

یہی قرآنی نقطۂ نظر ہے۔ روح، امر رب کا دوسرا نام ہے۔ تاہم دیگر مفسرین و محدثین کی طرح چوہدری صاحب بھی سورہ زمر کی آیتِ مبارکہ نقل کر دینے کے بعد اس کے ترجمے میں نفس کا معنی روح قرار دینے کی غلطی دہرا رہے ہیں۔

اَللّٰهُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِهَا

کا معنی ہے ''اللہ نفوسِ انسان کی موت کے وقت ان نفوس کو اپنے قبضے میں لے لیتا ہے'' وہ روحیں قبض کر لیتا ہے''۔ عیاں ہے کہ نفس کا معنی روح نہیں اور روح کا معنی نفس ہرگز نہیں ہو سکتا۔ حضرت علامہ جو کچھ بھی کہنا چاہتے ہیں اور جس بات کی تائید میں چوہدری مظفر حسین آیات قرآنی سے استشہاد کر رہے ہیں' سورہ زمر کی اس آیت مبارکہ میں نفس کو نفس تسلیم کر لینے سے ہی ان افکار کی توضیح زیادہ بہتر انداز میں کی جا سکتی ہے۔ بہرطور یہ ایک ایسا معاملہ ہے جسے ائمہ تفسیر نے وحدت الوجودی صوفیاء کی سہولت کے پیشِ نظر صدیوں پہلے سے غلط ترجمانی کی نذر کر رکھا ہے۔ اگر اس طرح اصطلاحات قرآنی

کی بے محل ترجمانی کا تعاقب کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نام پر پھیلائی گئی گمراہیوں کا منبع ترجمہ و تفسیر کی انہی غلطیوں میں پوشیدہ ہے۔

☆

''تصور آخرت اور نفسیات'' کے حوالے سے جو بحث اس کتاب میں کی گئی ہے وہ نہایت دلچسپ ہے۔علامہ اقبال حیات بعد الموت کو ایک عالمگیر قانون سمجھتے ہیں جس کا گہرا تعلق نظام زمانی سے ہے۔ اس سے علامہ کی مراد سوا اس کے اور کچھ نہیں کہ نظام زمان میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے جو موجودہ نظام کائنات کے خاتمے کا دن ہے۔یہی بات سورہ الروم کی آیت نمبر ۶ میں بتائی گئی ہے جہاں حیات بعد الموت کے آغاز سے قبل انسانی زندگی کے مکمل خاتمے کو اجل مسمیٰ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے۔تاہم کسی بھی تعبیر کے لحاظ سے اجل مسمیٰ کو ''معیّنہ امکان'' کا نام نہیں دیا جا سکتا،جیسا کہ چوہدری مظفر حسین کا خیال ہے(ص ۸۱) ہاں البتہ اجل مسمیٰ کو ہم خاتمۂ امکانات ہستی کہہ سکتے ہیں۔Heidegger کے الفاظ میں Impossibility of all the Possibilities حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کی رو سے نبی اکرم ﷺ نے انسانی شخصیت کو چاروں طرف سے ایک مربّع شکل میں گھرا ہوا دکھلایا اور ان حدود کو ''اجل'' کا نام دیا۔یہاں بھی اجل،انسانی شخصیت (نفس۔خودی) کے لیے خاتمۂ امکانات ہی کا مظہر ہے۔بقائے دوام کے بارے میں چوہدری مظفر حسین بجا طور پر اپنے تاثرات کا اظہار اس طرح کر رہے ہیں:

''چنانچہ علامہ اقبال کا یہ دعویٰ کہ بقائے دوام کے ہم امیدوار محض ہیں نہ کہ بر بنائے استحقاق حقدار،بالکل صحیح نظر آتا ہے۔(ص ۸۹)

یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے لیکن اس کی تائید میں كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (۸۸/۲۸) کے ''باطنی معانی'' کی تائید قطعاً بے محل ہے''اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے ہلاک ہو جانے والی ہے''قرآن حکیم کے یہ الفاظ اللہ تعالیٰ کے وحدئه لا شريك له' اور اوّل و آخر ہونے سے متعلق ہیں۔ان الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ توجۂ الی اللہ سے محروم ہو جانے والا ہلاک ہو جاتا ہے (ص ۱۹۵) جیسا کہ مولانا رومؒ کے حوالے سے چوہدری صاحب نے رقم فرمایا ہے(اگرچہ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں) امام راغب اصفہانی نے باطنی علما کے حوالہ جات سے ایسی بہت سی لایعنی باتیں اپنے ہاں درج کر دی ہیں جن سے اجتناب ہی قرآن حکیم کی تفہیم کے لیے بہتر ہے۔

ڈاکٹر محمد رفیع الدین نے اَلْزَمْنٰهُ طَائِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ اور مَالِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَلَا كَبِيْرَةً اِلَّا اَحْصَاهَا سے اگر انسان کا لاشعور مراد لے لیا ہے تو اس کے لیے پوری گنجائش موجود ہے۔انسانی ذہن کی Hard Disk اگر اپنی Memory میں یہ سبھی کچھ ریکارڈ کر رہی ہے جو لاشعور کا حصہ بنتا جا رہا ہے تو یہ بھی درست ہے کہ زندگی کی تمام سرگزشت کا اس طرح من وعن محفوظ رکھا جانا آخر کسی نہ کسی

مقصد کے لیے ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جو فرائڈ کی گرفت میں نہ آ سکا۔ ڈاکٹر صاحب کی اس دلیل کی تائید میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نفس انسانی کی موت کے وقت اس کی سرگزشت حیات کا یہ ریکارڈ ''سِجّین اور عِلیّین ''، میں منتقل ہو جاتا ہےاور یہ ''کِتَاب'' مَرقُوم '' بالآخر انسان کو اس کے لیے اچھے اعمال کی جزا اور برے اعمال کی سزا کے لیے یَومُ الدّین اس کے سامنے پیش کر دی جائے گی۔

تاہم دو امور پر غور کر لینا چاہیے ایک تو یہ کہ ''طائر'' سے مراد نصیب ہے (منحوس ہو یا مبروک) جسے ہم لاشعور کا حصہ قرار نہیں دے سکتے۔ اس آیت کا اگلے حصے میں فرمایا ہے کہ ''وَنُخرِجُ لَہٗ یَومَ القِیَامَۃِ کِتَاباً '' ''ہم ہر شخص کے لیے قیامت کے روز ایک کتاب نکالیں گے'' چنانچہ کتاب کا تعلق انسان کے اعضاء و جوارح (گردن اور جیسا کہ دوسری آیت میں بتایا ہاتھوں) سے ہو سکتا ہے اور اس سارے معاملے کو لاشعور سے متعلق ثابت کرنے کی کوشش تا حال ناکافی ہے۔ دوسرے یہ کہ یوم حساب کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلیَومَ نَختِمُ عَلیٰ اَفوَاھِھِم وَ تُکَلِّمُنَا اَیدِیھِم ''اس دن ہم ان کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور ان کے ہاتھ ہمارے سامنے بولیں گے''۔ ہاتھوں کا کلام لاشعور سے کس صورت متعلق ہو سکتا ہے، اس کی تطبیق بھی زیرِ غور آنی چاہیے۔

☆

''خودی اور آخرت ''، جیسے اہم موضوعات پر چوہدری مظفر حسین صاحب کی اس کتاب کا اگلا باب ''تصورِ آخرت اور جنت و دوزخ'' سے متعلق ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ ایک مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ موت کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتا ہے کیونکہ اس کی پوری زندگی کی جدوجہد آخرت میں کامیابی حاصل کرنے پر ہی مرکوز رہتی ہے۔ موت مومن کے لیے ایک تحفہ ہے جس پر وہ خدا کا شکر بجالاتا ہے۔ (ص ۱۰۳) علامہ اقبال زندگی اور موت، جنت اور جہنم سے زیادہ عمل پر زور دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک خیر و شر کا معیار ہی یہ ہے کہ جو عمل خودی کو استحکام بخشے وہ چیز جنت ہے اور جو عمل خودی میں اختلال و انتشار پیدا کرے وہ شر ہے اور دوزخ ہے۔ (ص ۱۰۵) دوزخ انسان کے اندر بحیثیت انسان فلاح یا ناکامی کا کرب انگیز احساس ہے (تَطَّلِعُ عَلَی الاَفئِدَۃِ) بعثت کا مطلب ہے فنا اور ہلاکت کی قوتوں پر غلبے اور کامرانی کی مسرّت یعنی سلامتی ہی سلامتی اور خوف و غم سے نجات (ص ۱۰۶) بعثت بعد الموت کوئی خارجی حادثہ نہیں بلکہ خودی ہی کے اندر ایک حیاتی عمل کی تکمیل ہے اور جسے انفرادی یا اجتماعی لحاظ سے بھی دیکھیے دونوں صورتوں میں محاسبۂ ذات کی وہ ساعت ہے جس میں خودی اپنے گزشتہ اعمال کا جائزہ لیتی اور مستقبل میں اپنے ممکنات کا اندازہ کرتی ہے (ص ۱۰۷)

اگرچہ علامہ اقبال کے یہ خیالات مروّجہ افکار سے پوری طرح میل نہیں کھاتے تاہم علامہ کا یہ استدلال کافی وزن رکھتا ہے۔ اوّلاً عالمِ آخرت کی حقیقت ہماری علمی رسائی سے ماورا ہے، جنت اور دوزخ کے بیانات میں قرآن و حدیث میں تمثیلی پیرائے میں زندگی کو ایک مستقل حیاتی عمل کی صورت میں دکھایا گیا ہے اور آخرت کے حقائق نظروں میں سمانے والے نہیں۔ ثانیاً خودی یعنی نفسِ

انسانی خلود کی منزل پر جلوہ گر ہونے والا ہے بنابریں وہ ایک ارتقائی عمل سے گزر رہا ہے چنانچہ یہ کہنا کہ بعثت بعدالموت خودی کے اندرونی احوال ہی سے متعلق ہے، کچھ ایسا غلط بھی نہیں۔ ثالثاً قرآن حکیم ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ ''یَومَ تُبَدَّلِ الْاَرضُ غَیرَ الْاَرضِ'' تو ایسا ماحول جس سے انسانی ذہن آشنا نہیں، اس کا بیان محض تمثیلی انداز میں ہی ممکن ہے۔ نہ وہ زمین ایسی ہوگی، نہ مکان، نہ وہ پھل ایسے ہوں گے نہ مشروبات۔ اصل حقیقت واقعہ بس ایک ہی ہے کہ لَهَا مَا كَسَبَتْ، جو کچھ انسان نے اس دنیا میں کمایا، اس کی جزا و سزا اسے مل کر رہنی ہے۔ یہ سارا معاملہ نشو و نمائے بدن سے متعلق نہیں بلکہ اس کی اصل ایک ایسی اخلاقی بنیاد و فراہم کرنا ہے جو نفسِ انسانی کو حقیقتِ نَفْسُ الْاَمْرِی سے قریب تر کر سکے۔

بعض مقامات پر چوہدری مظفر حسین صاحب نے جو نکتہ آفرینیاں کی ہیں وہ لائق توجہ ہیں۔ سیّد سلیمان ندوی اور دیگر علما کے حوالے سے آپ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دوزخ کو دوام نہیں۔ انسان کے اخلاقی وجود کی اصلاح کے بعد یقیناً اس کی ضرورت باقی نہیں رہنی چاہیے تاہم قرآن حکیم میں مومنین کے ساتھ ساتھ کافرین کے لیے بھی ''خَالِدِینَ فِیهَا'' کے ساتھ ''اَبَداً'' کے الفاظ بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کفر و شرک میں آخری حدوں کو چھونے والے فرعون و نمرود اور ابوجہل و ابولہب اسی دوامی دوزخ کا ایندھن بنے رہیں گے جس کا وعدہ اللہ جل شانہ نے بار بار دہرایا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بھی واضح ہونا چاہیے کہ سورہ رحمٰن میں جو لفظ ''آلَاءِ رَبِّكُمَا'' بار بار دہرایا گیا ہے، اس کا معنی فقط نعمتیں ہی نہیں بلکہ مولانا اصلاحی کی رو سے اس کے معنی قدرتیں عظمتیں، شانیں، نوازشیں اور احسانات بھی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ایک ہی جامع اصطلاح ''آلاء'' کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہے یعنی ''تم اللہ کی کن کن نشانیوں کو جھٹلاؤ گے''۔ اس طرح جہنم کی کیفیات کے بارے میں یہ اشتباہ ختم ہو جانا چاہیے کہ انہیں بھی نعمت قرار دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کا حور و غلمان کے بارے میں طویل اقتباس دلچسپی سے خالی نہیں۔ آپ کی رائے میں حور و غلمان کا وجود انسانی مرد و زن ہر دو کے لیے دلنواز حسن و جمال اور سرور انگیز ہم نشینی کا حامل ہوگا (ص ۱۱۳) تاہم قرآن حکیم کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غلمان محض خدمت گار رہوں گے نہ کہ ازواج۔ اب ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حیات بعدالموت کے ضمن میں قران حکیم نے مومنین کے لیے جنت میں تواضع کا جو بندوبست بیان کیا ہے اس میں ''حُورعِین'' کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ جبکہ اس کے مقابل طبقۂ نسواں کی دلجوئی کے لیے ایسی کوئی سبیل نہیں۔ غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی زیادتی کی بات نہیں ہے۔ علامہ اقبال کے خواتین کے بارے میں افکار سے اہل علم بخوبی آگاہ ہیں۔ جب سینٹ میں مخلوط تعلیم کا بل پاس ہونے کی اطلاع علامہ تک پہنچی تو آپ جوش میں آ کر فرمانے لگے۔ ''آج مسلمانوں نے اپنی ذلت پر مہر لگا دی ہے''۔ ہم سمجھتے ہیں کہ علامہ کی یہ بات قرآنی طرز فکر ہی کی نمائندہ ہے۔

قرآن حکیم نے حورعین یعنی خواتینِ جنت کے بارے میں فرمایا حُورٌعِین كَاَمْثَالِ اللُّؤلُؤِ

الْـمَـكْنُون غزال چشم حوریں محفوظ کیے ہوئے موتیوں کی مانند، وَ جَـعَـلْـنٰهُنَّ اَبْكَاراً ہم نے انہیں کنوارا بنایا، لَمْ يَطْـمِثْهُـنَّ اِنْس" قَبْلَهُمْ وَ لَا جَانٌ" انہیں انس وجن میں سے اس سے قبل کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ اور حُـور "مَـقْـصُـورَات" فِي الخِيَام، حوریں جو خیموں میں بند ہوں گی۔ ان تمام آیات سے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ خواتینِ جنت کا مقام پاکیزگی اور عفت وعصمت، گھر کی چار دیواری میں رہ کر اپنے فرائض انجام دینے کا ہے۔ طبقۂ نسواں کے لیے خودی کی منزل آخریں یہی ہے۔ اسی میں ان کی عظمت ہے اور یہی ان کا انعام ہے۔

☆

اس کتاب کا چھٹا باب زمان ومکان کے بارے میں ہے۔ علامہ اقبال کے افکار پر چوہدری مظفر حسین کے تبصرے کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ آزادی اور بقائے دوام لازم وملزوم ہیں۔ ایمان 'کفرِ' طاغوت، دنیوی علائق سے وارستگی، استغفار، ارادۂ اختیاری، قوت تخلیق، عشق اور ندرت فکر وعمل جیسے اوصاف حسنہ سبھی آزادی کے وسیع مفہوم میں شامل ہیں (ص ۱۲۵)

روح کی آزادی میں جو چیز انسانی شخصیت کو بقائے دوام کا مستحق بناتی ہے وہ عشق ہے (ص ۱۲۸) اللہ تعالیٰ کی محبت ایک وجود ساز عمل ہے جس کا خاصہ یہ نہیں کہ دوسری خودیاں اس میں جذب ہو جائیں۔ بلکہ یہ ہے کہ دوسری خودیاں نشوونما پا کر اس قدر مستحکم ہو جائیں کہ وہ اپنی انفرادیت کو برقرار رکھ سکیں (ص ۱۳۰) غرض خودی کی بقائے دوام کا راز للّٰہیت میں ہے، کثرتِ ذکر سے خدا کی محبت شعلے کی طرح روشن ہو جاتی ہے۔ ذکر کی اعلیٰ ترین صورت نماز ہے جو خودی کی زندگی اور اختیار کے حقیقی سرچشمے کے قریب لا کر اسے اپنی ذات پر قابو حاصل کرنے کا موقع دیتی ہے (ص ۱۳۲) علامہ اقبال کے نزدیک اگر انسان ان آرزوؤں میں شریک ہو جو اس کائنات میں ارادۂ خداوندی کی تخلیق ہیں تو وہ کائنات کی تقدیر خود متشکل کر سکتا ہے (ص ۱۳۴) مردِ حر یا مردِ آزاد سے مراد ایسا شخص ہے جس کی شخصیت کا ماورائی پہلو اس حد تک نشوونما پا گیا ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر کے انسانِ مرتضیٰ کے مقام پر فائز ہو جائے جہاں خدا کی رضا اور بندے کی رضا میں فرق کرنا محال ہو (ص ۱۳۷) یہ ذہنی رویّہ انسان کو یہ ایقان بخشتا ہے کہ زمان ومکان اور علیّت یعنی نیچر پر تسلّط واقتدار اس کا حق ہے اور زمانِ خالص میں موت سے بھی آگے اس کے لیے بقا کی منزل ہے (ص ۱۳۸) معیّتِ الٰہی میں انسان جس قسم کے زمان کا تجربہ کرتا ہے، علامہ اقبال کے نزدیک حقیقی زمانہ وہی ہے۔ اور طبعی زمانہ یا **Serial Time** تو محض اس کی ایک خارجی جہت ہے یہی وہ زمانہ ہے جس کا مشاہدہ باطن کی دنیا انائے بصیر کرتی ہے (ص ۱۴۳)

اس بحث کے آخر میں چوہدری صاحب نے نہایت بلیغ انداز میں زمان ومکان اور آخرت کے تعلق کو واضح کر دیا ہے:

> اگر چہ ہم اپنی عملی زندگی اس طبعی زمان ومکان میں گزارنے پر مجبور ہیں جو اس خارجی اور مادی دنیا کے طور پر ہمیں گھیرے ہوئے ہے۔ تاہم باطنی زندگی میں جس زمان کا تجربہ ہمیں

معیّتِ الٰہی میں ہوتا ہے وہ ہمیں اس مادی دنیا کے جبر سے آزادی دلاتا ہے اور ہم اس مادّی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس سے ماورا محسوس کرتے ہیں اور یہی ماورائیت ہمیں اپنے لافانی ہونے کا شعور بخشتی ہے (ص ۱۴۷)

یہ ساری بحث نہایت حکیمانہ ہے اور انتہائی پرمغز۔ تاہم اس مقالے کے آغاز ہی میں قطعاً غیر ضروری طور پر منظور الحسن عباسی کی جانب سے ایک آیتِ قرآنی کی تشریح نقل کر دی گئی ہے۔ عبّاسی صاحب کے خیال میں مَنْ یَکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْ مِنْ بِاللّٰہِ کے الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کیا جانا چاہیے کہ ''کفر بالطاغوت کو ایمان باللہ پر تقدیم حاصل ہے'' (ص ۱۲۷) اگر ہم دیگر قرآنی اور نبوی افکار سے راہنمائی حاصل کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو فطرت الٰہیہ پر خلق کیا گیا ہے اور طاغوت کی حیلہ سازیاں بعد میں وارد ہوتی ہیں چنانچہ کفر بالطاغوت کا مرحلہ ایمان باللہ پر مقدم نہیں۔ بلکہ ایمان باللہ کو کفر کے پردے میں ڈھانک دیئے جانے کے بعد کا مرحلہ ہے اور یقیناً یہی اصلاحی عمل مطلوب بھی ہے۔ تاہم ''لا'' پر اس قدر اصرار صوفیاء کا خاصہ ہے۔ جو نفیِ ذات کو ہمیشہ مقدّم رکھتے ہیں حالانکہ یہ تصور محض غیر مسلموں سے حاصل کردہ ہے اور دینِ اسلام کا مقصود مطلوب نہیں ہے۔ جیسا کہ آزادیٔ ارادہ اختیار کی بحث میں علامہ اقبال نے واضح کیا، خودی کی نفی نہیں بلکہ اس کی تکمیل اور نشوونما ہی مقصودِ حقیقی ہے۔

☆

اگلا باب خودی کے ارتقائی مدارج سے بحث کرتا ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک خودی کی بقائے دوام ایک ارتقائی عمل کے ساتھ مشروط ہے۔ سورہ المعارج میں انسان کی شخصیت کے ارتقائی مدارج کا ذکر ہے۔ قیامت کے حوالے سے اس کی خلوت و تنہائی کا ذکر ہے جو کہ خودی کی ارتقائی ضرورت کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ اس کے بعد خودی کے استحکام و ارتقا کی شرائط ہیں جو اعمالِ صالحہ اور اخلاق حسنہ پر مشتمل ہیں۔ یہ انداز بھی موجود ہے کہ کمزور شخصیتوں کی ہلاکت عین ممکن ہے۔ (ص ۱۶۰)

علامہ انسان کو لامحدود قُوّت ارادی کا ایسا احسنُ التّقویم جرثومہ خیال کرتے ہیں جس میں بے پناہ نشوونما کے امکانات مضمر ہیں۔ شخصیت (خودی) کو مستحکم بنانے والا اندازِ زیست اختیار کر کے ہم درحقیقت موت کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں۔ اسی لیے شخصی بقائے دوام ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے۔ (ص ۱۶۵)

اس باب میں چند اور امور لائقِ توجہ ہیں۔ پہلا یہ کہ انسان کو دوبارہ جسمِ ظاہری دینے کا مقصد یہ نہیں کہ وہی پہلے جیسا جسم اس کو دوبارہ دیا جائے گا (ص ۱۵۶) یقیناً اس بات کا پورا امکان موجود ہے کہ جس طرح زمین و آسمان بدل جائیں گے اسی طرح انسانی جسم بھی کسی نئے انداز میں جلوہ گر ہوں، ایسا انداز جو جنت کے ماحول کے لیے موزوں تر ہو۔ دوسرا مسئلہ اللہ تعالیٰ کے تصور کے بارے میں ہے، علامہ بجا طور پر یہ اعلان کر رہے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اسلام کا خدا قوت کا مظہر ہے۔ عیسائیت خدا کو محبت کا مظہر بیان کرتی ہے اور اسلام خدا کو قوت کا مظہر تسلیم کرتا ہے۔ یعنی ایک زندہ

اور قوی خدا جو قوی ارادے کے ساتھ اپنے بندوں میں شخصیت کے استحکام کا طالب ہے۔ تیسرا معاملہ ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور قارئین کے لیے یہ وضاحت ضروری خیال کرتے ہوئے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ چوہدری مظفر حسین صاحب کے لَایَسْمَعُوْنَ حَسِیْسَھَا (۱۰۲/۲۱) کو صاعقۂ قیامت سے متعلق جان لیا ہے حالانکہ اس آیت سے قبل اللہ تعالیٰ مشرکین سے خطاب فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم سب جہنم کا ایندھن بنو گے۔ ازاں بعد مومنین کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ جہنم کا قرب تو در کنار اس کا شور و غل کبھی بھی ان کی سماعتوں سے نہیں ٹکرائے گا۔

☆

تصورِ آخرت اور تسلسل فرائض ایک اور موضوع ہے جس پر چوہدری مظفر حسین نے قلم اٹھایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> بقائے دوام درحقیقت خود شعوری کی سطح پر انسانی زندگی کے ان امکانات سے عبارت ہے جو زندگی میں بالقوہ پائے جاتے ہیں اور جو بالفعل وجود میں آ کر زندگی کو قائم و دوائم رکھتے ہیں۔ (ص ۱۷۷)

اسی ضمن میں آپ کہتے ہیں کہ ممکنات زندگی کی کوئی حد نہیں ہے اور ان کو بروئے کار لاتے رہنے کا ہی دوسرا نام بقائے دوام ہے۔ قرآنی نظریہ تخلیق کی رو سے انسان بھی کوئی تکمیل یافتہ شے نہیں بلکہ وہ مسلسل تخلیق کے دائرۂ عمل میں ہے۔ زندگی کے بارے میں لامتناہی امکانات کے ظہور پذیر ہونے کو قرآن ''اَجْر'' غَیْرَ مَمْنُوْن '' کا نام دیتا ہے اور انسان اسِ عملِ تخلیق میں مصروف رہتے ہوئے بقائے دوام حاصل کر سکتا ہے (ص ۱۸۷)

خودی کا استحکام حرکت، عمل اور تخلیقی صلاحیتوں کے نکھار سے عبارت ہے، ادھر اہلِ جنت کو مُتَّکِیئنَ عَلَی الْاَرَائِكِ تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ظاہر کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ کیفیت بے عملی اور ناکارہ ہونے کی ہے۔ لیکن ساتھ ہی قرآن حکیم میں یہ بھی مذکورہ ہے کہ دَعْوٰھُمْ فِیْھَا سُبْحٰنَكَ اللّٰھُمَّ وَ آخِرُ دَعْوَ اھُمْ اَنِ الْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن۔ ان الفاظ پر قرآن حکیم کی روشنی میں غور کریں۔ قرآن فرماتا ہے کہ شجر و حجر سمیت کائنات کی ہر شے اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو وظیفۂ حیات ان کے لیے مقرر کیا گیا ہے، اسے پوری طرح ادا کرتی ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ بات کہ ملائکہ کی زبان سے کہلوایا گیا۔ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِسُ لَك۔ یہ تسبیح و تحمید محض زبانی کلام نہیں ہے، خود قرآن پاك نے یہ وضاحت کر دی ہے کہ ملائکہ ہر طرح کے امور کو نی انجام دیتے ہیں اور تدبیر امر میں مصروف رہتے ہیں (فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْراً)۔ چنانچہ یہ مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہونا چاہیے کہ اہل جنت کا دعویٰ تسبیح و تحمید، جنت میں بھی ان کے فکر و عمل کی توانائیوں کے بھرپور اظہار اور ان کی تخلیقی اہلیتوں کے نکھار کا تذکرہ ہے۔ اقبال کا یہ نقطۂ نظر بھی قرآنی افکار ہی پر مبنی ہے۔

☆

کتاب کے آخر میں چوہدری مظفر حسین صاحب نے ڈاکٹر تاثیر اور علی عباس جلال پوری جیسے ناقدین کی جانب سے علامہ اقبال کے فکر پر اٹھائے ہوئے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ ان اصحاب کا یہ خلط مبحث حیران کن ہے کہ وہ بعث بعد الموت اور بقائے دوام میں تمیز نہیں کر سکتے۔ اسی ضمن میں موت کے بعد افرادِ آدم کے شخصی انجام کے بارے میں حضرت علامہ کی رائے بھی پیش کی گئی ہے۔ نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس قدر واضح قرآنی نظریے کے ہوتے ہوئے علامہ کو مفسرین و محدثین کی آراء سے کوئی مدد نہ مل سکی۔ بعض صوفیاء نے اپنے ذاتی کشف کی بنا پر بلند بانگ دعوے کیے ہیں لیکن فی الحقیقت وہ بھی قرآن میں بیان کردہ مکمل صداقت کا محض ایک جزوی سا بیان ہیں۔

علامہ اقبال بالکل درست فرماتے ہیں کہ مستحکم خودی کی حامل شخصیات کو مرنے کے معاً بعد اپنے آخری انجام سے ہم کنار کر دیا جاتا ہے۔ یہی قرآنی نظریہ ہے۔ انبیاء صدیقین اور شہداء (خواہ وہ مقتولین فی سبیل اللہ ہوں یا شہادت حق کا فریضہ انجام دے کر طبعی موت حاصل کرنے والے) اس جہانِ فانی سے رخصت ہوتے ہی جنت میں داخل کر دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح کفر و شرک میں ظلم و عداوت کی آخری حدوں تک جانے والے نمرود و شداد، فرعون، ہامان، قارون، ابولہب اور ابوجہل مرتے ہی جہنم واصل کر دیئے جاتے ہیں اور یہ بات بھی قرین قیاس ہے کہ جن افرادِ آدم نے حیاتِ دینوی میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا، جن کی خودی اپنی ابتدائی سطح سے ذرا سا بھی ابھر نہ پائی ہو، ان کے مقدر میں محض فنا ہے۔ نَسْیاً مَنْسِیاً ہو جانا ہی ان کا انجام ہے۔ اسی بنا پر ہم یہ بھی قیاس کر سکتے ہیں کہ معصوم بچے اور معذور افرادِ آدم کسی طرح بھی جزا و سزا کی منزلوں کے راہی نہیں بنائے جا سکتے۔

بہر حال چوہدری مظفر حسین صاحب کی یہ تصنیف بڑی عالمانہ شان کی حامل ہے۔ اس میں شامل مباحث بار بار پڑھے جانے کے قابل ہیں اور اقبالی ادب میں اس کا شمار ان نادر کتب میں کیا جائے گا جو خالصتاً تحقیقی و تخلیقی مواد کی حامل ہیں۔

نام کتاب	**خودی تے بے خودی** (پنجابی)
مصنف	ڈاکٹر ریاض مجید
ناشر	مسلم پنجابی مجلس، فیصل آباد
قیمت	۔/۱۵۰ روپے (مجلد ڈیلکس ایڈیشن)
سال اشاعت	۱۹۹۳ء
مبصر	ڈاکٹر وحید عشرت

پروفیسر ڈاکٹر ریاض مجید، نعت کے حوالے سے اور اپنی کتاب ''اردو میں نعت گوئی کے حوالے سے بڑے معروف ہیں، فیصل آباد میں اردو کے استاد اور علمی اور ادبی رونقوں کی بہار ان کے دم قدم سے ہے۔ زیرنظر کتاب خودی تے بے خودی انہوں نے پنجابی زبان میں لکھی ہے اس کے ابواب میں خودی، بے خودی، تنقیدی جائزہ اور اختتامیہ شامل ہیں۔ خودی اور بے خودی فلسفہ اقبال کا بنیادی جوہر ہے خودی جو تشخیص ذات، اپنی شناخت اور پہچان سے عبارت ہے برصغیر کی ایک خاص سیاسی، سماجی اور معاشرتی صورت حال میں فکر اقبال میں جلوہ گر ہوئی۔ خودی میں فرد کی شخصیت کے بنیادی جواہر، خواص اور تعمیر شخصیت کے بنیادی اصولوں کا بیان ہے۔ خودی کا حوالہ فرد ہے جبکہ اقبال کے تصور بے خودی میں جماعت کے مسائل کو زیر بحث لایا گیا ہے اور ایک جدید اسلامی فلاحی معاشرے کے قیام کی عصر حاضر میں راہ سجائی گئی ہے۔ ڈاکٹر ریاض مجید کی اس کتاب میں ان ہی دونوں تصورات کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اقبال پر پنجابی میں یہ پہلی معتبر اور سنجیدہ علمی کوشش ہے۔ جس میں اقبال کے شعری اور فلسفیانہ موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

نام کتاب	جبریل اڈاری
	(بال جبریل کا منظوم پنجابی ترجمہ)
مترجم	اسیر عابد
ناشر	اقبال اکادمی پاکستان، لاہور
سال	۱۹۹۵ء
قیمت	۱۲۵/- روپے
مبصر	ڈاکٹر وحید عشرت

جبریل اڈاری معروف پنجابی مترجم پروفیسر اسیر عابد کا شہکار ہے اس سے قبل اسیر عابد دیوان غالب کا پنجابی ترجمہ کر چکے ہیں اور ان کے پنجابی ترجمے کو بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ پروفیسر اسیر عابد اس ترجمے کے بارے میں لکھتے ہیں:

> بال جبریل کو علامہ اقبال کی شاعری کی معراج کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں علامہ کا فلسفہ اور پیغام بڑا نکھرا ہوا ہے۔

بال جبریل چونکہ علامہ کی پختہ اور اعلیٰ شاعری کا ایک عمدہ نمونہ ہے اور اس کی غزلوں میں فن اور مقصدیت کا رچاؤ تمام کمال کے ساتھ موجود ہے۔ ترجمے میں اس اعلیٰ معیار کو پوری طرح قائم رکھا گیا ہے۔ یہاں ہم ترجمے کا ایک نمونہ پیش کرتے ہیں تا کہ قارئین ترجمے کی خوبی سے آگاہ ہو سکیں۔

ناد ہو کیا شوق بر کاٹ میرے حجرے ذات اس لامکان اندر
بوہڑ بوہڑ سائیاں بوبو کار پے گئی بت خانیاں زی اسمان اندر
حوراں ملک تخیلاں وچ جوڑے جیویں تاڑ دیے بندی دان اندر
میری ویکھنی گھمنڈ دے پار ویکھے بیٹھا کون پھلکاریاں تان اندر

پھل دی پتی ہیرے نوں کوئی چیر کلیجے پاندی؟
مورکھ نوں نئیں ریشم ورگی گل ذرا بھر ماندی

مسجد قرطبہ کا پہلا بند ملاحظہ ہو

آوندے جاندے شام سویرے خلقن نقش نگاراں
آوندے جاندے شام سویرے موت، حیاتی کاراں
آوندے جاندے شام سویرے ، ریشم تند دورنگی
جیہڑی تندوں ذات ، صفات پوشاکاں انے ہزاراں
آوندے جاندے شام سویرے، ہاڑے ساز ازل دے
جس تھیں ذات پچھان کراندی کومل تیور تاراں
تینوں وی ایہ پرکھن بندیا مینوں وی ایہ پرکھن
آوندے جاندے شام سویرے جگ تے وانگ سناراں

اس ترجمے کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پنجابی زبان میں اظہار کے تمام پیرائے موجود ہیں صرف زبان پر مہارت کی ضرورت ہے اور اس کا واضح ثبوت پروفیسر اسیر عابد نے فراہم کر دیا ہے۔

نام کتاب	اقبال فکر و فن کے آئینے میں
مصنف	احمد ہمدانی
ناشر	اقبال اکادمی پاکستان، لاہور
قیمت	۷۰/- روپے، مجلد
سال	۱۹۹۵ء
مبصر	ڈاکٹر وحید عشرت

احمد ہمدانی صاحب معروف شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام پیاسی زمین ہماری نظر سے گزر چکا ہے۔ اقبال فکر و فن کے آئینے میں کتاب کے مضامین تصور خودی، تصور حرکت و تغیر، جدید کلچر، علامہ اقبال اور نظریہ وحدت الوجود یا تصوف، تصور فن، شمع و شاعر، مسجد قرطبہ، علامہ اقبال کی غزلیہ شاعری، خضر راہ اور اقبال کا ایک اجمالی جائزہ ہیں۔ احمد ہمدانی علامہ کے فلسفہ خودی کے بارے میں لکھتے ہیں۔

> خودی ایک ایسا جوہر ہے جو انساں کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے انسان کی خودی اس کی حقیقت اصلی ہے۔
>
> تصور خودی علامہ کے فلسفے کی بنیاد ہے۔ حرکت، تغیر، سعی و عمل، زمان و مکان، عقل و شعور اور حسن و عشق غرضیکہ ان کے تمام تصورات تصور خودی سے پھوٹتے ہیں۔
>
> خودی تجربے کا مرکز اور اس دنیا کی بنیادی حقیقت ہے اور یہ بنیادی حقیقت، ہیگل کے خیال مطلق اور بریڈلے کے حسی شعور کے برخلاف جذبے کی شدت کے ساتھ پوری شخصیت کا حوالہ اور پوری کائنات کی حقیقت اصلی ہے۔
>
> خودی کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار امکانات کے ساتھ پیدا کیا۔ ان امکانات کی حامل خودی ہے اور ان امکانات ہی میں اس کی تقدیر پوشیدہ ہے وہ ان امکانات کو بروئے کار لا کر اپنی تقدیر آپ بناتا ہے۔ علامہ کا یہ نظریہ افلاطون کے فلسفہ اعیان کی بالکل ضد ہے کیونکہ فلسفہ اعیان کے تحت

انسان کی تقدیر پہلے سے طے ہے۔

احمد ہمدانی نے جس خوبصورتی کے ساتھ اقبال اور افلاطون کی فکر میں بنیادی اختلاف کو بیان کیا ہے اور اقبال کے فلسفہ حرکت کو اپنے دوسرے مقالے میں بیان کیا ہے اس سے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اقبال کی فکریات کا گہرا شعور موجود ہے۔ اقبال اور وحدت الوجود والے مقالے میں احمد ہمدانی نے فلاطونس، شنکر اچاریہ اور ابن عربی کے حوالے سے اہم گفتگو کی ہے اور تینوں کے درمیان بنیادی فکر کے اختلاف کو واضح کیا ہے لکھتے ہیں۔

> ''پلائی نس (فلاطونس) یا شنکر اچاریہ اور حضرت ابن عربی وجود مطلق کو واحد تسلیم کرنے میں تو متفق ہیں لیکن وجود عالم اور انسانی خودی کے بارے میں ان کے خیالات میں بڑا فرق ہے۔ شنکر اچاریہ وغیرہ عالم اور انسانی خودی کو مایا، التباس اور شر کہتے ہیں اور انہیں دکھوں کا سبب سمجھتے ہیں جبکہ حضرت ابن عربی اور ان کے ہم خیال عالم اور انسانی خودی کو مظاہر حق سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عربی کے نزدیک ترک عمل ذریعہ نجات نہیں جبکہ شنکر اچاریہ وغیرہ کے ہاں ترک عمل کے علاوہ نجات کی کوئی صورت موجود نہیں ہے''۔

احمد ہمدانی اس طرح اقبال اور ابن عربی کو ایک دوسرے کے قریب لے آتے ہیں۔ احمد ہمدانی کے ہاں اس طرح کے بے شمار مسائل پر ایک مصالحانہ اور مفاہمانہ رویہ موجود ہے جو علمی اور خوش آئند ہے۔

نام کتاب	وزیر آغا کے خطوط اکبر حمیدی کے نام
مرتب	اکبر حمیدی
ناشر	بُٹر پبلشرز پی او بکس ۲۰۵۳، اسلام آباد
قیمت	۸۰/- روپے
مبصر	ڈاکٹر وحید عشرت

ڈاکٹر وزیر آغا پاکستان کی علمی اور ادبی لحاظ سے بڑی قد آور شخصیت ہیں۔ اقبالیات میں بھی ان کا نام بڑا معتبر ہے۔ اقبال پر تصورات عشق و خرد ان کی بڑی اہم کتاب ہے۔ اس کے علاوہ بھی علمی موضوعات، ادبی مسائل اور شعر کے حوالے سے ان کی کتب اپنا بلند مقام رکھتی ہیں۔ اب ڈاکٹر وزیر آغا اس مقام پر ہیں کہ ان کی تمام چیزیں منظر عام پر آئیں اور ان کے حوالے سے علمی اور ادبی کاوشیں جمع کی جائیں۔

اکبر حمیدی معروف خاکہ نگار، انشائیہ نویس اور شاعر ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ڈاکٹر وزیر آغا کے ان کے نام خطوط پر مبنی ہے۔ جن میں علمی و ادبی مسائل پر بہت کم گفتگو موجود ہے۔ تاہم دیباچے میں ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے حوالے سے گفتگو بے محل ہے۔

اکبر حمیدی کے نام زیادہ تر خطوط نجی نوعیت کے ہیں اور ان کی ادبی افادیت محض اس قدر ہے کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط ہیں اور اکبر حمیدی کے نام ہیں۔ ایک خط میں ڈاکٹر صاحب نے انشائیہ کی ہئیت پر بحث کی ہے اس کا اقتباس نذر قارئین ہے:

> انشائیہ مضمون کے اسلوب میں بھی لکھا جا سکتا ہے اور افسانے کے اسلوب میں بھی، گو افسانے کے اسلوب میں لکھنا قدرے مشکل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر انشائیے کا موضوع سبک اور لطیف ہو تو وہ افسانوی اسلوب میں ضم ہو جاتا ہے اور اس کی معروضی حیثیت باقی نہیں رہتی خود انشائیہ نگار بھی جب دونوں کے سنگم کو قبول کر لیتا ہے تو اس کے اسلوب میں افسانوی بہاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ جو تفکر کو ملائم کر کے خود میں جذب کر لیتا ہے اور انشائیہ کا معروضی اور قدرے (detached) رویہ مدھم پڑ جاتا ہے۔